Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنے کے بعد اُس نے بولنا شُروع کیا۔ "میرا نام یکُوب اوان ہے۔ یہ میرے ساڑھے بارہ ایکڑ کے کاغذات۔۔۔۔"

"او ہو ہو ہو۔۔۔۔" شیر بہادر ماتھے پر ہاتھ مار کر بولا۔ "بارہ ایکڑ کی گردان چھوڑ، اللہ کے واسطے بات کو سمجھ۔ رقبے کا ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ بس یہ کہہ کہ یہ میرے کاغذات ہیں۔"

"میرا نام یکُوب اوان ہے،" اُس نے دوبارہ شُروع کیا، "یہ میرے کاغذات ہیں۔" وہ رُک کر شیر بہادر کو دیکھنے لگا۔

"ہاں ہاں، آگے بول،" شیر بہادر نے کہا۔

"ابے سالے، کیا بک بک لگا رکھی ہے۔" یعقوب اعوان جلدی سے بول اُٹھا۔

شیر بہادر نے دونوں ہاتھوں سے سر پیٹ لیا۔ "اوئے بے عقلے یہ تو صِرف مثال کے طور پر سکھایا تھا۔"

"مثال کے طور پر؟"

"ہاں ہاں۔ وہاں پر تو جی جناب کر کے بات کرنی ہو گی۔"

یعقوب اعوان نے گلا صاف کیا۔ "اچھا۔ میرا نام یکُوب اوان ہے۔ یہ میری جائیداد کے کاغذ ہیں۔ جی جناب۔۔۔۔" یعقوب اعوان نے دوبارہ گلا صاف کیا اور سانس برابر کی، "جی جناب۔۔۔۔" وہ آگے نہ چل سکا تو آنکھیں کھول کر شیر بہادر کو دیکھنے لگا۔

شیر بہادر انتہائی مایُوسی اَور غصّے کی حالت میں اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"چلو اُٹھو،" اُس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "ہم کِس چکّر میں پڑ گئے ہیں۔ اس کا تو دماغ بند ہے۔"

ادھر سے فارغ ہو کر شیر بہادر اَور ساتھیوں نے دھوڑ دُھوپ کر کے یُو۔پی سے ہجرت کر کے آیا ہوا ایک آدمی تلاش کر لیا، جِس کے کاغذات میں ردوبدل کر کے ملک فلک شیر نے رائے بشن داس کی حویلی اَور دس مُربّعے زمین غیاث الدین انصاری، مہاجر از فیض آباد، یو۔پی کو الاٹ کروا دی تھی۔ مَلک فلک شیر اب ریٹائر ہو چکے تھے۔ اُنہوں نے بادامی باغ میں ہوزری کی دو فیکٹریاں اَور ملحقہ زمین و مکانات اپنے کچھ عزیزوں کو جو مہاجر ہو کر آئے تھے، الاٹ کروا دی تھیں۔ یہ فیکٹریاں اب پھیل کر دھاگا اَور کپڑا بنانے کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کارخانوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ جن میں ملک فلک شیر اور ان کے بھائی کا بڑا حصّہ تھا۔ جہان آباد کا ملک عالم جہاں فوت ہو چکا تھا اور اس کا بیٹا ملک جہانگیر اعوان ملک فلک شیر کا بہنوئی اور علاقے کا ایم۔ ایل۔ اے تھا۔ اُس نے بھی فلک شیر کی اعانت سے مزید بارہ مُربع متروکہ اراضی کو اپنی ملکیت میں شامل کر لیا تھا۔ ملک جہانگیر کو اعجاز کئی بار دیکھ چُکا تھا، مگر فلک شیر صرف ایک مرتبہ اس کی نظر سے گزُرا تھا، جب وہ علی بہادر کے بیٹے کی شادی میں شرکت کی خاطر آیا تھا۔ شادی رائے بشن داس کی حویلی میں منعقد ہُوئی تھی۔ حویلی کی عمارت سے الگ، احاطے کی دیوار کے اندر کئی چھوٹے بڑے کمرے ایک قطار کے اندر تعمیر شدہ تھے، جو کِسی زمانے میں گھوڑوں اور دُوسرے زرعی مویشیوں اور ان کے رکھوالوں کی رہائش گاہ کے طور پہ استعمال ہوتے تھے۔ ان میں سے چار بڑے کمرے غیاث الدین انصاری مہاجر اور اُس کے خاندان کو دے دیئے گئے تھے۔ ان کے لئے ایک مُربع زمین بھی چھوڑ دی گئی تھی، جِس پہ آٹھ اِنسانوں کے اس کنبے کی خُوشی سے گزُر اوقات ہوتی تھی۔ باقی کی زمین اور حویلی شیر بہادر اور اُس کے دو ساتھیوں نے معمولی رقم کے عوض غیاث الدین انصاری سے خرید لی تھی۔ جِس طور رات کی رات میں اعوانوں نے بشن داس کے کمیوں کو بھگایا اور جائیداد پہ قبضہ کیا تھا اُسے دیکھ کر غیاث الدین انصاری نے بلاچوں و چراں رجسٹری کے کاغذات پہ دستخط کر دیئے تھے۔ شیر بہادر اور اس کا بھائی آدھی آدھی حویلی کے مالک تھے۔ نیز ان کے قبضے میں ساڑھے تین تین مُربع اراضی تھی۔ اپنے چچازاد وریام کو اُنہوں نے دو مُربع زمین دے دی تھی۔ شیر بہادر نے برلب سڑک ایک مُربع رقبہ پر سنگتروں اور لیموؤں کا باغ لگایا تھا، جو اب ڈیڑھ لاکھ سالانہ پہ اُٹھتا تھا۔

"لالہ، ایک مالٹا توڑ لُوں؟" سرفراز نے پُوچھا۔

"ٹھہرو،" اعجاز نے کہا، اور ہاتھ بڑھا کر ایک نسبتاً پکے ہُوئے مالٹے کا انتخاب کیا۔

"یہ لو۔"

سرفراز آدھا زرد اور آدھا سبز مالٹا دانتوں سے کاٹ کر چھیلنے لگا۔ مالٹے کی تازہ تازہ تیز بُو اعجاز کی ناک میں چڑھی تو اُسے گیارہ سال پہلے کی وہ رات یاد آگئی جب اُس کے ماموں کے گھر پر اعوانوں کے تینوں آدمی اپنی تجویز لے کر آئے تھے۔ اس رات کو بھی عُمر دراز نے خُوب پکے ہُوئے کھٹے میٹھے سنگتروں سے ان کی تواضع کی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کھٹا ہے،" سرفراز نے دانتوں کے نیچے سے "سی" کی آواز پیدا کرتے ہُوئے کہا، مگر مالٹا چوسنا نہ چھوڑا۔

ایک تیز رو خیال اعجاز کے ذہن سے گزُرا۔ "یہ باغ ہمارا ہو سکتا تھا۔"

اعجاز کئی بار اس حویلی اَور زمین پہ آیا گیا اَور باغ کے اَندر گھوما پھرا تھا۔ مگر آج دوپہر کے سانحہ نے اُس کے ذہن کی جو حالت بنا رکھی تھی اُس کے زیرِ اثر ان جگہوں کو دیکھ کر پہلی بار اُس کے اَندر کچُھ افسوس، کچُھ احساسِ زیاں، کچُھ حسد اَور کچُھ غصّے کے ملے جُلے جذبات پیدا ہُوئے تھے۔

شجاع آباد کا میونسپل پرائمری سکُول سن باون سے مڈل سکُول کا درجہ اختیار کر چُکا تھا۔ ہیڈ ماسٹر محمد نواز چیمہ ایک پرُانے استاد اَور، منشی فاضل کے ذریعے سے، بی۔اے کے ڈگری یافتہ تھے۔ بارہ بجے کے قریب اُنہوں نے اردو، حساب اَور ڈرائنگ کے ماسٹر محمد اعجاز اعوان کو، جو اپنی تعلیم اَور طوالت ملازمت کے لحاظ سے غیر رسمی طور پر سکینڈ ہیڈ ماسٹر تصور کیے جاتے تھے، اپنے دفتر میں طلب کیا۔ ہیڈ ماسٹر محمد نواز چیمہ ایک نہایت تجربہ کار، ہوشیار اَور وضع دار آدمی تھے۔ سکُول میں سخت انتظام رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ماسٹروں سے شفقت کا سلوک روا رکھتے تھے۔ اُنہوں نے اعجاز کو اپنے سامنے کرسی پر بٹھایا۔

"میں ابھی انسپکٹر کے دفتر سے ہو کر آیا ہُوں،" وہ بولے۔

"جی،" اعجاز نے احتراماً جواب دیا۔

"اچھی خبر لایا ہُوں۔ سوچا کہ سب سے پہلے تمُھیں سناؤں۔"

"مبارک باد کا موقعہ ہے چیمہ صاحب؟"

"یوں ہی سمجھو، اگرچہ بمطابق محاورہ، یہ کھالا آنے سے پہلے چھلانگ لگانے والی بات ہو گی۔"

اعجاز ہیڈ ماسٹر کے ساتھ ان کی مسکراہٹ میں شریک ہو گیا۔ "سکُول کو ہائی کا درجہ ملنے کا وعدہ لے کر آیا ہُوں۔" نواز چیمہ نے کہا، "تجویز تو تمُھیں علم ہے بہت پہلے کی پیش کی جا چکی ہے۔ ٹالتے ٹلاتے یہ وَقت آگیا ہے۔ آج تو میں جا کر وہاں بیٹھ ہی گیا، کہا کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈِیشن لے کر ہی جاؤں گا۔"

"ڈیشن مِل گیا چیمہ صاحب؟"

"ارے بھائی ڈِیشن ایسے تھوڑا ہی ملا کرتے ہیں، یہ تو کہنے کی باتیں ہیں۔ بہرحال وعدہ پکّا لے کر آیا ہُوں کہ کیس بھاری ری کمنڈیشن کے ساتھ اُوپر بھیج دیا جائے گا۔"

"جی پھر تو مبارک باد کی بات ہو گئی۔" اعجاز نے کہا۔

بات کا جواب دینے کی بجائے ہیڈ ماسٹر نے ٹھوڑی جُھکا کر عینک کے شیشوں کے اُوپر سے ایک کڑی نظر اعجاز پہ جما دی۔ یہ ایسی نِگاہ تھی جو ان کے چہرے پہ عادتاً سرزنش کرنے سے پہلے نمودار ہوا کرتی تھی۔

"ایک گڑبڑ ہو گئی ہے، اعجاز،" وہ بولے۔

اعجاز احتیاط سے سنبھل کر بیٹھ گیا۔ "جی، چیمہ صاحب۔"

"شکایت ہو گئی ہے۔"

"کِس بات کی، چیمہ صاحب؟"

"تمُہاری، بچّے، تمُہاری۔ تُم خُوب جانتے ہو میں کِس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہُوں۔ میں پہلے بھی ایک بار اس کا ذکر کر چُکا ہُوں۔ مجُھے اُمید تھی کہ تُم سنبھل جاؤ گے۔ مگر معلوم ہوتا ہے تُم نے اس وارننگ کا اثر نہیں لیا۔"

"مگر چیمہ صاحب،" اعجاز نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "مَیں تو اُس کے بعد یُونین کے کِسی آدمی سے نہیں ملا۔"

"مگر سلیم خان سے تمُہاری ملاقات جاری ہے۔"

"وہ تو میرا پُرانا دوست ہے۔ کوئی عہدیدار بھی نہیں، یونین کا تنخواہ دار ملازم ہے، صرف نوکری کرتا ہے۔ اُس کے ساتھ کبھی یونین کے کِسی معاملے کی بات ہی نہیں ہُوئی۔ دُور پار سے برادری کا آدمی بھی ہے۔"

"اعوان صاحب،" ہیڈ ماسٹر چیمہ طنزیہ لہجے میں بولے، "آپ کِس دُنیا میں رہتے ہیں۔ مارشل لاء لگ چُکا ہے، کچُھ پتا ہے آپ کو؟ پہلے دیواروں کے کان ہوتے تھے، اب آنکھیں بھی لگ گئی ہیں۔ مِنٹ مِنٹ کی خبر اُوپر پہنچ رہی ہے۔ کیوں ہم سب کی روزی گنوانے کے چکّر میں ہو؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"چیمہ صاحب، غلطی ہو گئی، مجھے خبر نہ تھی،" اعجاز نے کہا، "اگر ایسی بات ہے تو میں سلیم خان سے بھی ملنا چھوڑ دوں گا۔"

اب ہیڈ ماسٹر نے اعجاز کی جانب سے نگاہیں پھیر لیں۔ جب وہ دوبارہ بولے تو اپنے آگے میز کو دیکھ رہے تھے، اور ان کے لہجے میں لچک دار فولاد کی سی سختی تھی۔ "اس سے کام نہیں چلے گا بھئی۔"

اُن کی گفتگو کے دوران ہیڈ ماسٹر کا لہجہ ایسی آہستگی سے درجہ بدرجہ بدلتا آیا تھا کہ اب اعجاز نے گویا پہلی بار ان کی آواز کا یہ انداز سُنا اور خطرے کا احساس اُس کے دِل میں جاگنے لگا۔

"ایسے کام نہیں چلے گا،" ہیڈ ماسٹر نے دُہرا کر کہا اور ایک ٹائپ شدہ کاغذ میز کی دراز سے نکال کر اعجاز کے آگے بڑھا دیا۔

"اس پہ دستخط کر دو۔"

"یہ کیا ہے؟" اعجاز کی رُکتی ہُوئی آواز نِکلی۔

"تُمہارا استعفیٰ ہے۔" ہیڈ ماسٹر نے اکتائے ہُوئے لہجے میں ہاتھ ہِلا کر کہا، "پڑھ لو۔"

"مگر---- میں---- چیمہ صاحب، میں سلیم خان سے----"

"دیکھو محمد اعجاز، تُم بہت عمدہ اُستاد ہو۔ کیا تُمہارا خیال ہے کہ میں تُمہیں ہاتھ سے کھو کر خُوش ہُوں؟ مگر بیٹا، معاملہ میرے ہاتھ سے نِکل گیا ہے۔ صرف ایک آدمی کی وجہ سے اس سکُول کو تالہ بھی لگ سکتا ہے۔ مَیں تو ازخود ملک جہانگیر اعوان تک پہنچا ہُوں۔ مگر ان کا کہنا ہے کہ وہ تو ذی فنکٹ ہُوئے بیٹھے ہیں۔ پھر بھی اُنہوں نے کچُھ نہ کچُھ اثر ورسُوخ استعمال کیا اور استعفیٰ پر بات ختم ہُوئی ہے۔ نہ ڈِس مس، نہ ڈسچارج نہ برطرف۔ آگے سروس ملنے میں بھی کوئی دُشواری حائل نہ ہو گی۔ یہی تُمہارے حق میں بہتر ہے۔ ورنہ تو میاں گرفتاریوں کا معاملہ تھا۔ تُمہیں عِلم ہے لاہور میں کیا ہو رہا ہے؟"

"جی---- نہیں۔"

"خیر چھوڑو اس بات کو۔ تُمہیں پتا چل جائے گا۔ اس پہ دستخط کر دو اور شکُر کرو کہ تُمہارے بہی خواہ ابھی دُنیا میں موجُود ہیں، بات آگے نہیں بڑھی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جس وَقت سے اعجاز سکُول سے نِکل کر گھر آیا تھا اُس وَقت سے صرف ایک بات کا غبار اُس کے دِل پہ چھایا ہُوا تھا: یہ کیسے ہُوا کہ اس موقعے پر اُسے کچُھ مُہلت مانگنے کی تدبیر نہیں سوجھی؟ کیونکر اس کا ذہن اِس لمحے کے اَندر اس حد تک ماؤف ہو گیا تھا کہ کوئی حیلہ، کوئی بہانہ، کوئی فرصت اُس کو میسّر نہ آئی اَور اُس نے خاموشی سے، کپکپاتے ہُوئے ہاتھوں کے ساتھ اس کاغذ پہ دستخط کر دیئے اَور اُٹھ کر وہاں سے چلا آیا تھا؟؟ اُس نے اپنی کلاس کے ڈیسک سے اپنی ذاتی کاپی بھی نہ اُٹھائی تھی۔ اُسے کلاس کے چھوٹے چھوٹے بے خبر بچوں سے شرم محسُوس ہونے لگی تھی۔ اس "شرم" کا غبار اُس کے اَندر پھیلتا جا رہا تھا۔

"لالہ، وہ آدمی کیا کر رہے ہیں؟" سرفراز نے پُوچھا۔

"کنوَاں کھود رہے ہیں،" اعجاز نے متوجہ ہو کر جواب دیا۔

"چلو چل کے دیکھیں۔"

ایک زمانے کے بعد اعجاز نے کنواں کُھدتا ہُوا دیکھا تھا۔ اِس کا رواج اب یہاں سے غائب ہوتا جا رہا تھا۔ ٹیوب ویل کی رسم پڑتی جا رہی تھی۔ جِس کے لئے حکُومت سے قرضے اَور دیگر رعایتیں حاصل ہو جاتی تھیں۔ کنوئیں کا گڑھا پانی تک پہنچ چُکا تھا، اَور اِس وَقت اِس میں چَک اُتارا جا رہا تھا۔

یہ پُرانی تقریب اعجاز کے ذہن میں بچپن کے وَقت سے محفوظ تھی۔ آخری بار جب اُس نے چَک کنوئیں میں اُترتے ہُوئے دیکھا تو اُس وَقت وہ دس یا گیارہ برس کا رہا ہو گا۔ کبیر سِنگھ والے میں کنواں کھودا جا رہا تھا اَور وہ سکُول سے واپس آکر سیدھا وہاں پہ پہنچ جایا کرتا اَور جھٹپٹا ہونے تک وہیں بیٹھا کِسانوں کو زمین کے اَندر سے مٹّی نکالتے اَور گڑھے کو گہرا ہوتے ہوئے دیکھتا رہتا۔ کنواں کھودنا ہنرمندی کا کام تھا۔ اردگرد کے بارہ گاؤں کے اَندر سب سے بڑا ماہر کبیرے کا بلبیر سِنگھ تھا۔ جِس گاؤں میں کنوئیں کی کُھدائی کرنا ہوتی وہاں بلبیر سِنگھ کو لے جایا جاتا۔ سب سے پہلے وہ مقام کا انتخاب کرتا تھا۔ وہ بُوڑھا سِکھ زمین کا ایسا بھیدی تھا کہ ایک کدال مار کر بتا دیتا پانی کِس گہرائی پہ نِکلے گا۔ وہ پانی کی خصلت تک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے واقف تھا۔ "کھارا ہے،" وہ گیلی مٹی کو سونگھ کر کہتا، "دیسی کماد ہو جائے گا پر رس دار نہ ہو گا۔ پھٹی بھی نِکل آئے گی۔ اناج کے لائق نہیں ہے۔"

اناج بونے کے خواہش مند زمیندار بلبیر سنگھ کے پیچھے اگلے مقام کی تلاش میں چل پڑتے۔ "رقبہ تو ختم ہونے کو ہے، بلبیر سنگھ جی،" وہ تفکر سے کہتے۔

"اپنے رب پر بھروسہ کر، قدم قدم پر اُس کے کرشمے ہیں۔"

"رقبے کے اندر سچا پانی مِل بھی جائے گا؟" زمیندار پُوچھتا۔

"زمین کے کھیل آسمان کے کھیل سے دُگنے ہیں بھاپے۔ مرلے مرلے کے نیچے الگ الگ نالہ بہتا ہے۔ کوئی کڑوا، کوئی کسیلا، کوئی میٹھا۔"

"آپس میں مِلتے جُلتے نہیں؟"

"سب کے اپنے اپنے رستے ہیں، اپنی اپنی چال جیسے میری چال الگ اور تیری چال الگ۔ دونوں مِل بھی جائیں مگر خصلت ایک نہیں ہو سکتی۔" بلبیر سنگھ کا قول پُورا اُترنے والا تھا۔ جس جگہ پہ وہ کدال رکھ دیتا وہیں پہ دائرہ کھینچ کر کھُدائی شروع کر دی جاتی۔ کھُدائی زمین میں گڑھا نکالنے والوں کا کام نہیں تھا۔ اُس کے الگ کاری گر تھے جو عموماً بلبیر سنگھ کے ساتھ جگہ جگہ چلتے تھے۔ گڑھے کا قطر، اُس کی دیواروں کا عمود اور ان کی گولائی، ہر لمحے یہ باتیں دھیان میں رکھی جاتی تھیں۔ مضبوط رَسیوں سے بندھی بڑی بڑی بالٹیاں چاروں جانب سے لٹکائی جاتیں اور مٹی سے بھری ہُوئی اُوپر کھینچ لی جاتی تھیں۔ ان کی مٹی آس پاس کے کھیتوں میں پھیلا دی جاتی تھی بلبیر سنگھ ہاتھ میں شیشم کی چھمک پکڑے، ہر دم گہرے ہوتے ہُوئے گڑھے کے گرداگرد چکّر لگاتا، عقاب کی سی نظر ہر کدالئے پہ جمائے، زمین کے ہر دھارے کی مٹی کے مطابق ہدایات دیتا ہوا دِن بھر گھومتا رہتا۔ ایک دھارا ریتلی مٹی کا ہوتا تو اگلا چکنی مٹی کا، اور اس سے آگے بُھربھری گاچی کی شکل کا نِکلتا۔ کھودیئے ہر دھارے کی سختی اور نرمی کو جانچ کر کدال لگاتے کہ کہیں پہ ہاتھ حساب سے کم یا زیادہ بھاری نہ پڑے کہ گولائی میں فرق آجائے۔ حتیٰ کہ کھودتے کھودتے تہہ سے کیچڑ نِکلنے لگتا، جو بتدریج پتلا ہوتا جاتا۔ جب گدلے پانی کی لہر چڑھتی تو بالٹی بھر اُوپر کھینچا جاتا۔ پھر باریک ململ کے ٹکڑے کو دوہرا چوہرا کر کے اس "پانی" کو چھانا جاتا۔ سب سے پہلے بلبیر سنگھ صاف پانی کا گھونٹ بھر کر مُنہ میں کھنگالتا۔ کنوئیں کے مالکان کے علاوہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گاؤں کے سب لوگ جنہیں پانی نِکلنے کی خبر پہنچ چکی ہوتی، یہ دیکھنے کے لئے دم سادھے کھڑے ہوتے کہ بلبیر سِنگھ پانی کو تھُوکتا ہے یا کہ نگل جاتا ہے۔ جیسے ہی گھونٹ بلبیر سِنگھ کے حلق سے اُترتا، ہجوم سے ایک فلک شگاف نعرہ بلند ہوتا۔

"سچا پانی!"

مالکان کو مبارک بادیں ملتیں، بلبیر سِنگھ کی پینچھ ٹھونکی جاتی۔ زمین کی گود میں وہ گول گڑھا کنوئیں میں تبدیل ہو چُکا ہوتا تھا۔ اب کُھدائی کا کام روک کر چَک اُتارنے کا مرحلہ آتا۔ جِس روز کنوئیں کی کُھدائی کا کام شُروع ہوتا تھا اسی دِن گاؤں کے ترکھان تناور درَخت کاٹ کر ان کی چھلائی اَور ٹھکائی میں لگ جاتے تھے۔ چَک کے لئے صرف کالی ٹاہلی کی لکڑی استعمال میں لائی جاتی تھی جِس پہ پانی کا کیڑا مار نہ کر سکتا تھا۔ اُس کے علاوہ موٹے تنوں کی ضرورت پڑتی تھی جِن کے اَندر سے لکڑی کے ٹکڑے کمان کی شکل میں کاٹے جاتے تھے تاکہ چَک کی گولائی میں فرق نہ آنے پائے۔ پِھر ان ٹکڑوں کو سریش اور کیلوں کانٹوں اَور پیچوں کی مدد سے ایک منوں بھاری چکّر کی شکل میں جوڑا جاتا تھا۔ کنوئیں کے اَندر رکھنے سے پہلے چَک کے لئے زمین تیار کی جاتی تھیں۔ کنوئیں کی گولائی کے ساتھ ساتھ چکنی مٹی، جِس کے ڈھیر اُوپر کھیتوں میں لگے ہوتے تھے، ٹوکریوں میں بھر بھر کر پھینکی جاتی تھی جو دیواروں کے دامن میں ڈھیر ہوتی جاتی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ، لکڑی کے چوڑے تختوں کی مدد سے، جِن پہ کھڑے ہو کر چار چار کھودی مزدور کُودتے تھے، اس مٹّی کو اچھی طرح سے کوٹا جاتا تھا، حتیٰ کہ چَک کی چوڑائی کے برابر ایک گول تھڑی تیار ہو جاتی تھی۔ پِھر اُس کے اُوپر چَک رکھا جاتا جو ایسی نِیہنہ کا کام دیتا جہاں سے اینٹوں کی گول چُنائی اُٹھائی جاتی تھی۔

جب تھڑی تیار ہو جاتی تو گاؤں سے چَک کا جلوس چلتا تھا۔ اُسے دو بیلوں والی کھُلی گاڑی پہ لادا جاتا اَور ساتھ گاؤں بھر کی عورتوں، مردوں اَور بچوں کا ہجوم روانہ ہوتا۔ کنوئیں کے مُنہ پہ پہنچ کر مجمع ایک گول دائرے کی شکل میں کنوئیں کے کناروں پہ جمع ہو جاتا۔ چَک کے چاروں جانب دس بارہ جگہوں پر موٹے موٹے مضبوط رَسّے باندھے جاتے۔ ہر ایک رسّے کو پندرہ بیس جوان تھامے ہُوئے ہوتے تھے، جو ایک ساتھ رَسوں کو ہاتھوں کے بیچ سے اِنچ اِنچ سرکاتے ہُوئے چَک کو اُس طور کنوئیں میں اُتارتے تھے کہ اس کی کوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک جانب بھی دُوسری جانب سے اُونچی یا نیچی ہونے نہ پاتی تھی۔ جب چک مٹی کی تھڑی پر جم جاتا تھا تو رَسوں والے ہاتھ سے رَسّے چھوڑ دیتے تھے۔ مجمعے پر کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا جاتی۔ عورتیں آدھا مُنہ ڈھانپ کر چُپکے چُپکے رونے لگتی تھیں۔

جب کنوئیں کی آدھی اونچائی تک اینٹوں کی چُنائی ہو جاتی تو پھر "ٹوبے" اپنا کام شُروع کرتے۔ اعجاز نے یاد کیا کہ جب وہ چھوٹا سا تھا تو ٹوبے اس کے لئے دُنیا کے انتہائی پُراسرار لوگ ہوتے تھے۔ یہاں پر یہ ٹوبے، مگر کبیرے میں ڈوبے کہلاتے تھے۔ اُن میں سے کوئی اپنی ناک پہ پٹکا باندھ کر اَور کوئی صرف اُنگلیوں میں ناک کو داب کر ڈبکی لگاتا اَور اِتنی دیر تک پانی میں ڈوبا رہتا کہ جی گھبرانے لگتا تھا۔ جب وہ اُوپر آتے تو بالٹیوں میں مُختلف رنگوں کی کیچڑ نما مٹی اَور ریت بھر بھر کے لاتے تھے، گویا گدلے پانی کی تہہ میں سُرنگ لگا رہے ہوں۔ اِس طرح کبھی چند ہی گھنٹے، اَور کبھی دو دو دِن تک مصروف رہنے کے بعد وہ زیرِ زمین بہتے ہُوئے صاف پانی کے دھارے تک پہنچ جاتے۔ اِس ذخیرے سے پھر پانی تہہ در تہہ ریت کی چھلنی سے چھن چھن کر شفاف شکل میں کنوئیں کے اَندر چڑھتا آتا تھا اَور اپنے زور کی نِسبت سے ایک مقام پہ ہموار ہو کر ٹھہر جاتا تھا۔ سالوں پہلے کا وہ منظر اب اِس شام کو اعجاز کی آنکھوں کے سامنے اَیسے ہو بہو دوہرایا جا رہا تھا کہ کچھ وَقت کے لئے گویا وہ بہ نفسِ نفیس ماضی کے اس پُرانے مقام پہ پہنچ گیا اَور اُس کے ذہن سے یہ بات یکسر محو ہو گئی کہ ان دو مناظر کے بیچ ایک لمبے عرصے کا وقفہ ہی نہیں بلکہ دو ملکوں کی حدود کا رخنہ بھی پڑتا تھا۔ کنوئیں کے مُنہ پہ لوگوں کا ٹھٹ لگا تھا۔ سرفراز آگے نِکل کے ہجُوم میں گھُس گیا تھا اَور پاؤں کے بل، گھٹنے جوڑے، عین کِنارے پہ بَیٹھا تھا۔ اعجاز کو یوں لگا جیسے سولہ سال پیچھے وہ خود اس بچّے کی جگہ پہ بَیٹھا کنوئیں کے اَندر چک کو اترتے ہُوئے دیکھ رہا ہو۔ پرلی جانب بلبیر سِنگھ کی جگہ اس گاؤں کا ایک بُڈھا، ہاتھ میں لمبی سی سونٹی پکڑے، کڑی آواز میں رَسّے والوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ اعجاز کے دیکھتے ہی دیکھتے چک چکنی مٹی کی گادھی پر جم کر بَیٹھ گیا اَور رَسّے ہاتھوں سے چھُٹ کر کنوئیں کے اَندر جا پڑے۔ دیکھنے والوں کے اُوپر وقتی طور پر ایک سناٹا چھا گیا۔ مرد بھری بھری مطمئن نظروں سے کنوئیں کے اَندر جھانکنے لگے۔ کچھ بُوڑھی عورتیں اپنی چادروں سے آنکھوں کے آنسو پُونچھنے لگیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر یکایک مجمعے کے اندر ایک غلغلہ بلند ہُوا۔ سب آوازیں مردوں کی تھیں۔ ساتھ ہی ڈھول پر میلے کی تھاپ پڑی۔ چند نوجوان کِسانوں نے بازُو ہوا میں اٹھائے اَور ڈھول کے اردگرد گھومتے ہوئے، سر نیہوڑائے، بالوں کے لمبے پٹے جھٹکتے ہوئے، بدَن لہرا لہرا کر ناچنے لگے۔ اُدھر سے ایک بیَل گاڑی گڑ والے چاولوں کی دیگ لے کر آ پہنچی۔ مٹّی کے پیالوں میں سونف کی خُوشبو والے چاول کھودیوں، ٹوبوں، راج مزدوروں، چگ اُتارنے والوں، بچوں اَور دیگر لوگوں میں تقسیم کیے گئے۔ ڈھول کی تھاپ تیز ہو گئی اَور جوانوں نے ناچ ناچ کر گرد و غبار کا بادل اُٹھا دیا۔ عورتیں کچھ دیر تک انہیں دیکھتی رہیں، پھر بچوں کو لے کر دو دو، چار چار کی ٹولیوں میں واپس اپنے گھروں کو چل دیں۔

"چلو۔" اعجاز نے سرفراز کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

کنوئیں کے چھوٹے سے ٹیلے سے اُتر کر دونوں کچی سڑک پہ پہنچے اَور واپس گھر کے رستے پہ ہو لئے۔ ڈھول کی دھمک دُور تک ان کا پیچھا کرتی رہی۔ دھوپ کا رنگ بدل کر زرد ہوتا جا رہا تھا۔ اس علاقے کی زمین اِس قدر ہموار تھی کہ معلوم ہوتا تھا جیسے دور دُور تک ایک مہیب سہاگہ پھیر کر سطح کو ہموار کیا گیا ہو۔ حدِ نگاہ پہ آتشیں رنگ کا سُورج زمین سے مِلنے کو تیار کھڑا تھا۔

"لالہ، وہ عَورتیں کیوں رو رہی تھیں؟" سرفراز نے پُوچھا۔

"چگ جو ڈوب رہا تھا۔" اعجاز نے کہا۔

سرفراز ایک منٹ تک سوچتا رہا، گویا سمجھ نہ پا رہا ہو۔ "پھر وہ رو کیوں رہی تھیں؟" اُس نے دُہرا کر پُوچھا۔

"چگ زمین میں دفن ہو رہا تھا بھئی۔" اعجاز صبر سے بولا۔ "ایک بار گیا تو گیا۔ کنواں رہے نہ رہے، سُوکھ جائے، اِینٹیں اُکھڑ جائیں، چگ پھر کبھی دکھائی نہیں دیتا۔"

"جیسے قبر میں آدمی دفن ہو جاتا ہے؟"

اِس سوال پر اعجاز کو دِل میں ذرا سی حیرت ہُوئی۔ "ہاں!" اُس نے کہا۔

"مگر وہ تو لکڑی کا چگّر ہی تھا۔"

"صِرف لکڑی کا چگّر ہی نہیں تھا۔" اعجاز نے کہا۔ "اِس پہ درختوں کے درخت لگے تھے۔ اَیسے اَیسے درخت جو گاؤں کے سب لوگوں سے زیادہ عُمر رسیدہ تھے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"لالہ!" کچھ دیر بعد سرفراز نے پوچھا۔ "عمر رسیدہ کیا ہوتے ہیں؟"

"تم اب چھٹے درجے میں ہو، عمر رسیدہ کے معنی نہیں آتے؟ عمر رسیدہ بڑی عمر کے لوگ ہوتے ہیں، بوڑھے لوگ!"

"جیسے ابا تھا؟"

"ہاں!"

"پھر---" سرفراز نے کچھ دیر سوچنے کے بعد پوچھا۔ "پھر صرف عورتیں کیوں روتی ہیں؟"

"عورتوں کے دل میں ان باتوں کا درد ہوتا ہے۔ چک کے لئے عورتیں ہی روتی ہیں۔"

"ہمیشہ روتی ہیں؟"

"ہاں! جب میں تیری عمر کا تھا اُس وقت بھی روتی تھیں۔"

"اُس وقت تم کبیرے میں تھے لالہ؟"

"ہاں!"

"وہاں تو سکھ رہتے تھے۔" سرفراز نے کہا۔

"پھر کیا ہوا؟ ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اعجاز نے کہا۔ "لوگوں کے ہزاروں سال پرانے رواج ہوتے ہیں۔"

"لالہ! رواج کیا ہوتے ہیں؟"

"رسمیں!"

"کیسی رسمیں؟"

"لینے دینے کی رسمیں، رہنے سہنے کی رسمیں۔" اعجاز نے جواب دیا۔ "ان کے سہارے لوگ زندگیاں گزارتے ہیں۔"

"سکھوں کی بھی رسمیں ہوتی ہیں؟"

"اور نہیں تو کیا۔"

اعجاز اُس کے بچگانہ سوالوں سے کچھ چڑتا جارہا تھا۔ اب سہ پہر کے واقعہ کا بوجھ اُس کے ذہن پر دوبارہ چڑھتا آرہا تھا۔ وہ حویلی شمشیر سنگھ کے برابر سے گزر رہے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ حویلی ویران پڑی تھی۔

"لالہ!" سرفراز نے پُوچھا۔ "اس حویلی میں کوئی کیوں نہیں رہتا؟"

"اِس کے مالکوں کی آپس میں لڑائی ہے۔" اعجاز نے جواب دیا۔

بٹوارے سے پہلے اس علاقے میں جہان آباد والوں کے علاوہ دو بڑے زمیندار تھے۔ ایک بشن داس، جو کٹڑ ہونے کے باعث جلد ہی اپنی جائیداد چھوڑ کر بھاگ گئے۔ دُوسرے رائے بہادر شمشیر سنگھ جی جو ایک پڑھے لکھے، روشن خیال آدمی تھے۔ اُن کے مُسلمانوں، سِکھوں اَور انگریزوں کے ساتھ یکساں تعلقات تھے۔ چُنانچہ پاکستان بننے کے پُورے بارہ ماہ بعد تک وہ اپنی زمین پر قابض بیٹھے رہے۔ گاہے گاہے افواہ اُڑتی کہ رائے بہادر صاحب اِسلام قبول کر چکے ہیں۔ ایک بار خبر یہاں تک نِکلی کہ تبدیلی مذہب کے بعد اُنہوں نے اپنا نام سردار بہادر شمشیر علی خان رکھ لیا ہے مگر وَقت گزرنے کے ساتھ اِن افواہوں کی تردید ہوتی گئی۔ اُدھر مُلک کے حالات نہ ٹھہرنے تھے نہ ٹھہرے۔ مہاجروں کی یلغار ہوتی گئی اَور عوام میں غم و غصّے کی لہر اُٹھتی رہی۔ رائے بہادر شمشیر سنگھ جی کی موجُودگی میں ہی ایک مقامی شخص نے جعلی کلیم داخل کرکے اُن کے لارنس روڈ والے وسیع مکان پر قبضہ جما لیا تھا۔ اپنے اثر و رسُوخ کے باوجُود رائے بہادر صاحب قبضہ واپس لینے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ یہ مکان وہ اپنی اکلوتی بیٹی، جو اپنے سرکاری ملازم میاں کے ساتھ دلی اَور شملے میں رہتی تھی، کے نام وقف کر چکے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اِس واقعہ کی وجہ سے اُن کا دِل اس سرزمین سے اُچاٹ ہو گیا تھا۔ بالآخر اُنہوں نے بھی اپنا ڈیرہ اُٹھایا اَور اپنے دِلّی والے مکان میں جا بسے۔

بِشن داس کی حویلی کا معاملہ تو شجاع آباد کے اعوانوں نے بخیر و خُوبی طے کر لیا تھا۔ حویلی شمشیر سنگھ کا معاملہ ٹیڑھا نِکلا۔ یہاں کپور تھلے کے ایک رئیس خان فرمان علی خان کا کنبہ اَور نُور پُور کے ملکوں کا خاندان بیک وقت آوارد ہُوئے۔ فرمان علی خان تو اُسی دم مہاجر ہو کر آئے تھے جب کہ ملک رجب علی کا گھرانہ عرصہ ایک سال سے اس جائیداد پر گھات لگائے بیٹھا تھا۔ رجب علی کُل سات بھائی تھے، جن میں سے چھ بے اولاد تھے۔ قدرت نے گویا اِس کمی کو پُورا کرنے کے واسطے ملک رجب علی کو آٹھ بیٹوں سے نوازا تھا۔ ساتوں بھائیوں کی کل ملکیت معمولی سا رقبہ اراضی تھا جس پہ اُن کی گزر بسر ہوتی تھی مگر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک ہی گھر کے یہ پندرہ مرد آپس میں اِتفاق کی بناء پر مُٹھی کی مانند اِکٹھا ہو جانے کی روائیت رکھتے تھے۔ گاؤں کے اندر چنانچہ اِس گھرانے کی ایک حیثیت اَور ایک قوت تھی۔ دُوسری جانب فرمان علی خان کی سات کنواری بیٹیاں اَور ایک کمسن بیٹا تھا مگر کپورتھلے کے یہ پٹھان دِل کے جری تھے۔ اپنی دو نالی بندوق اَور کارتُوسوں کا ڈبہ سوتے جاگتے بغل میں رکھتے تھے گویا اکلوتی جان سے دُنیا بھر کا مقابلہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ جِس رات کو دونوں فریقوں نے ایک ساتھ آکر حویلی میں پڑاؤ ڈالا اُس شب سے گویا اُس مکان کے بیچوں بیچ ایک اَن دیکھی دیوار چُن دی گئی تھی۔ کوئی آٹھ گھنٹے تک گولیوں کا تبادلہ ہوتا رہا حتیٰ کہ ملکوں کی دیسی رائفل جام ہو گئی جب کہ فرمان علی خان کے آگے چلے ہُوئے کارتُوسوں اَور خالی ڈبّوں کا ڈھیر لگ گیا اَور اِن کی دغادغ چلتی ہُوئی بلجیئم ساختہ بارہ بور نہ تھمی۔ اس پہلے معرکے میں جیت فرمان علی خان کی رہی اَور ملک رجب علی کے قبیلے کو اس بات کا احساس ہو گیا کہ اُن کا پالا ایک نئی قِسم کے مہاجر سے پڑا ہے جو آسانی سے ہار ماننے والا نہیں۔ مگر اُنہوں نے اپنے مورچے نہ چھوڑے اَور حویلی دو بازوؤں میں بٹی رہی۔ پھر پولیس آئی، مجسٹریٹ موقعہ پر آیا، گرفتاریاں ہوئیں، ضمانتوں پر رہائیاں عمل میں آئیں۔ کارروائی تھانوں کی حاضریوں سے شُروع ہو کر دیوانی عدالتوں اَور پھر ہائی کورٹ میں پہنچی۔ فوجداری کے خاتمے کی خاطر فوری طور پر دونوں فریقوں کو آمنے سامنے سے ہٹایا گیا اَور حویلی خالی کرا دی گئی مگر مُلحقہ زمین پر فریقین نے اپنے اپنے قبضے کو نہ چھوڑا۔ غربی اراضی کے نوّے ایکڑ ملکوں کے نیچے اَور شرقی کے ایک سو دس ایکڑ فرمان علی کے قبضے میں رہے۔ فرمان علی خان کے رقبہ میں دس ایکڑ کا امرُودوں کا باغ بھی شامل تھا۔ رجب علی کے قبضہ کے اندر رقبہ گو کم تھا مگر اُن کے حِصّہ میں ایک بھٹہ خشت آگیا تھا جو آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ تھا۔ قانونی لحاظ سے فرمان علی خان کا قبضہ اُن کی ہندوستانی جائیداد کی دستاویزات کے مطابق حق بجانب تھا۔ رجب علی خاندان کا کلیم اس بات پہ مبنی تھا کہ یہ زمین اُن کے آباؤ اجداد سے رائے بہادر شمشیر سِنگھ کے دادا ساہوکار کلویر سِنگھ نے اونے پونے اَور رہن وغیرہ کے بدلے ہتھیا لی تھی، جسے اب قدرت کے قانون کے مطابق وہ واپس اپنی ملکیت میں لے رہے تھے۔ ملکوں کا کُنبہ اپنے افراد کے بل بوتے پر قبضہ قائم رکھنے کے قابل تھا۔ فرمان علی خان تن تنہا ہی اپنی وسیع حدود کی حفاظت میں جُٹے تھے۔ دو نالی کندھے پہ اَور کارتُوس کا ڈبہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بغل میں لِئے اپنے کنبے کے علاوہ سب مزارعوں کو اپنے سائے میں رکھے، وہ آدھی آدھی رات تک کبھی کِسی کھیت میں اَور کبھی باغ میں کھڑے نظر آتے تھے۔ اُس جدّی پُشتی رئیس کو جب ہاتھ سے کام کرنا پڑا تو اُنھوں نے کمر کِس کے ایسی محنت کر دکھائی کہ سن اکیاون باون میں ہی اُن کا باغ چالیس پچاس ہزار کا اُٹھنے لگا تھا۔ اب تو اُن کے دِن بدَل چکے تھے۔ ہاتھ بٹانے کو بیٹا جوان ہو چُکا تھا اَور چھ داماد آ شامل ہُوئے تھے جو سب کے سب مُختلف محکموں میں حکُومت کے افسر لگے تھے۔ باغ سے ملحقہ شاندار مکان تعمیر ہو چُکا تھا۔

دُوسری طرف رجب علی کے کُنبے نے اپنی زمین میں ایک کی بجائے سات پکے مکان ساتھ ساتھ کھڑے کر لِئے تھے۔ زمین کا مقدمہ بدستور عدالت میں چل رہا تھا۔ دونوں فریقوں کی آمدنی اِس حد تک بڑھ چکی تھی کہ روپیہ ہائی کورٹ تک چڑھایا جا رہا تھا۔ مُلک کی مُختصر سی تاریخ میں پہلی بار ایک ایسا موقعہ آیا جِس کا دورِ غلامی میں خیال تک نہ کیا جا سکتا تھا، یعنی عدالت عالیہ کے ایک رُکن پر طرفداری کا شبہ کیا جانے لگا تھا۔ ہتک عدالت کے خوف سے کِسی وکیل کی جرأت نہ تھی کہ کُھل کر بات کرے، مگر بھاری پتھر کی تعمیر شدہ ہائی کورٹ کی اُس بارُعب عمارت میں اَن دیکھی دراڑیں نمودار ہونا شُروع ہو گئیں اَور خلقتِ خُدا کا اِیمان، جو بٹوارے کے طوفان کے اَندر پہلے ہی گومگو کی حالت میں تھا، ڈگمگا اُٹھا۔ مقدمہ چلتا رہا، گو اِس سے اب کچُھ حاصل ہونے کا امکان صفر کے برابر رہ گیا تھا۔ قبضہ جاریہ کو گیارہ برس سے اُوپر کا عرصہ ہو گیا تھا اَور کِسی ایک فریق کی بے دخلی قریب قریب ناممکن ہو چکی تھی۔ زمانے کے ساتھ ساتھ فریقین ایک دُوسرے کی موجُودگی کو تسلیم کر چکُے تھے اَور دِل کی کدورتیں بڑی حد تک صاف ہو چکی تھیں۔ شیر بہادر اعوان کی بیٹی کی شادی پر ملکوں کا سارا خاندان جو گھُوم پھر کر اعوان برادری سے ہی تعلق رکھتا تھا، اَور فرمان علی خان مدعو تھے، جہاں دس برس کے عرصے میں پہلی بار اِن کی آپس میں علیک سلیک ہُوئی تھی۔ کچُھ عرصے بعد صلح جوئی میں اُس وَقت مزید پیش قدمی ہُوئی جب محکمہ اِنکم ٹیکس نے بھٹہ خشت کی آمدنی کو غیر زرعی قرار دے کر اُس پہ دس سال کا مجموعی ٹیکس لگا دیا۔ فرمان علی خان کا بڑا داماد پنجاب بورڈ آف رَیونیو کا ممبر تھا۔ رجب علی نے مَلک جہانگیر اعوان کو بیچ میں ڈال کر سفارش کی غرض سے فرمان علی خان کو پیغام بھجوایا۔ فرمان علی خان نے روائتی وضع داری کا مظاہرہ کرتے ہُوئے پُرزور سفارش کی اَور کچُھ رشوت دینے دلانے کے بعد ٹیکس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی ادائیگی کا ایک چوتھائی سے بھی کم رقم پہ تصفیہ ہو گیا۔ اس کے بعد میل ملاپ میں تو اضافہ نہ ہوا مگر ہر دو فریق کے مابین گویا ایک اَن کہا معاہدہ ہو گیا کہ دَوڑ دُھوپ کرنے کی ضرورت نہیں رہی، جِتنا روپیہ حکومتی کارندوں کو چڑھاوہ چڑھ چُکا، اب آگے اپنا مال اپنے ہاتھ میں رہے، البتہ مُقدّمے کو، چھیڑ خُوباں کے طور، اپنی رفتار سے چلنے دیا جائے۔ شہر کا چکّر لگتا تھا، دُنیا کے کام کاج میں شرکت کا بہانہ اَور خُوش وقتی کا سامان ہو جاتا تھا۔ زِندگی آرام سے گزُرنے لگی تھی۔

اِس سارے قصے میں نقصان صرف حویلی کا ہُوا تھا۔ حویلی کی قفل بندی کا حکم روزِ اوّل سے قائم تھا۔ اسّی سالہ پُرانی عمارت بارہ برس سے ویران پڑی تھی۔ اُس کی دہری اَور تہری اِینٹوں کی موٹی دیواروں اَور ستونوں سے پلستر اُکھڑ چُکا تھا اَور موسم کی طویل شدتوں نے جگہ جگہ اِینٹوں میں سوراخ ڈال دیئے تھے۔ میناروں کے کنگرے ڈھے گئے تھے۔ عقبی باغیچے میں پھل دار درختوں کو پانی دینے والا کوئی نہ رہا تھا اَور وہ عرصہ ہُوا سُوکھ کر مُردہ ہو چکے تھے۔ اُن کے بیچ خودَرو گھاس کا جنگل سَر سے اُوپر نِکلتا تھا۔ رجب علی اَور فرمان علی خان کے مزارعوں نے اُن کی شاخوں کو، جو سال بہ سال پھُولوں اَور میووں سے لدی رہا کرتی تھیں، کاٹ کاٹ کر جلا لیا تھا۔ بچوں نے کنکر پتھر مار مار کے دروازوں کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالے تھے جِن کے راستے گزُر کر چڑیوں کبوتروں اَور فاختاؤں نے کمروں میں گھونسلے بنا لیئے تھے۔ زمین کی نمی دیواروں پر دس دس فٹ تک چڑھ آئی تھی جِس پہ کائی کی موٹی تہہ جمی تھی۔ یہ عالیشان عمارت جِس کی تعمیر پہ اسّی سال پہلے کے زمانے میں بھی لاکھوں کا خرچہ اُٹھا ہو گا، اب ایک کھنڈر کا نقشہ پیش کرتی تھی۔

"لالہ! اِس میں جِن رہتے ہیں؟" سرفراز نے پُوچھا۔

"کوئی بھی نہیں رہتا۔" اعجاز نے کہا۔

"باسا کہتا ہے بارہ سال مکان خالی رہ جائے تو اِس میں جِن آجاتے ہیں۔"

"باسا بیوقوف ہے۔"

"لالہ! باسا سکُول سے بھاگ جاتا ہے۔" کچھ دیر کے بعد سرفراز نے کہا۔

سکُول کا لفظ اعجاز کے دماغ پہ گویا ہتھوڑے کی طرح آکر لگا۔ سرفراز کی بات کا جواب دیئے بغیر اُس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ سرفراز کچھ دیر رُک کر حویلی کو دیکھتا رہا، پھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھاگ کر اعجاز سے جاملا۔ وہ مزید سوال کرنے کے لئے مُنہ کھولنے ہی والا تھا کہ اُن دونوں کا دِھیان ایک عَورت کی جانب مُڑ گیا جو بائیں طرف کے کھیتوں سے نِکل کر اچانک سڑک پر نمودار ہوگئی تھی۔ عَورت اِن سے سو گز کے فاصلے پر سڑک کے بیچوں بیچ کھڑی، ہاتھ پھیلائے واویلا کر رہی تھی۔ اعجاز تیز تیز چلتا ہُوا عَورت کے سامنے جارُکا۔

عَورت کی عُمر کوئی پچیس چھبیس برس کی ہوگی۔ اُس کی جلد کا رنگ کوئلے کی مانند سیاہ تھا اَور ناک نقشہ ایسا تیکھا کہ اعجاز اُس پہ نظریں جمائے دیکھتا رہا۔ عَورت کے چہرے پہ بے شِکن جلد چمک دار پٹی کی مانند تنی ہُوئی تھی۔ اُس کے بدَن پہ فالتُو ماس کی بوٹی تک نہ تھی۔ لمبے اَور پتلے، چمک کے سے لچک دار بدن پر کُرتے کے اَندر کھُلی چھاتیاں تندی سے سر اُٹھائے کھڑی تھیں۔ اُس کے کپڑے غلیظ اَور جگہ جگہ سے پھٹے ہُوئے تھے اَور وہ بین کے اَنداز میں ہاتھ پھیلائے رو رہی تھی۔

"مَلک جی بچا لو، اللہ کے نام پر رحم کرو مَلک جی!" عَورت اعجاز کی قمیض کھینچتے ہُوئے بولی۔ "میرے آدمی کو بچالو، ظالم اُس کی جان لے لیں گے۔ میری اَور میرے بچّے کی مدد کرو، تُمہیں خُدا کا واسطہ"

سرفراز نے اِدھر اُدھر دیکھا، مگر اُسے کوئی بچّہ دکھائی نہ دیا۔ عَورت اکیلی کھڑی دونوں ہاتھوں سے اعجاز کا بازُو دبوچے چیخ و پُکار کر رہی تھی۔ سڑک کے بائیں جانب، تین چار کھیت چھوڑ کر ملکوں کا بھٹہ خشت دکھائی دے رہا تھا۔ بھٹے کی حدود کے ساتھ ساتھ کئی کچے گھروندے بنے تھے جِن میں بھٹہ مزدُور اَور اُن کے کنبے رہتے تھے۔ ایک گھروندے کے باہر مردوں عَورتوں اَور بچوں کا چھوٹا سا مجمع لگا تھا۔ اِس جمگھٹے میں کچُھ ہلچل دکھائی دے رہی تھی۔ عَورت کے اشاروں پہ اعجاز نے دُور سے ایک نِگاہ اُن لوگوں پہ ڈالی، پھر اُس کی نظریں واپس عَورت کے چہرے پہ لوٹ آئیں۔ عَورت اعجاز کا بازُو کھینچتی ہُوئی اُسے کچی سڑک پر لے چلی جو بھٹے کو جاتی تھی۔ پیچھے پیچھے سرفراز بھی چل پڑا۔

ایک کچے گھروندے کے سامنے سے لوگوں کو ہٹاتے ہُوئے جَب وہ دروازے تک پہنچے تو اَندر کا منظر دیکھ کر سرفراز کا دِل دہل گیا۔ وہ جلدی سے اعجاز کی ٹانگوں کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا اَور عقب سے سر نکال کر دیکھنے لگا۔ دو تنومند آدمی ایک کالے کلوٹے، سُوکھے سڑے آدمی کو بے دردی سے پیٹ رہے تھے۔ مار کھاتا ہُوا آدمی زمین پر پڑا، لاتوں اَور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گھونسوں کی بوچھاڑ تلے ایک گٹھڑی کی مانند اِدھر سے اُدھر لڑھک رہا تھا۔ دونوں حملہ آور ساتھ ساتھ خوفناک آواز میں غلیظ گالیاں دے رہے تھے۔ گھروندے میں قدم رکھتے ہی عَورت نے ایک جست بھری اَور زمین پہ پڑے آدمی کے اُوپر گر کر اُسے اپنے بدَن سے ڈھک لیا۔ مارنے والوں میں سے ایک نے عَورت کو بالوں سے گھسیٹ کر الگ کیا اَور دھکا دے کر دُور پھینک دیا۔ اعجاز سے نہ رہا گیا۔ اُس نے قدم اُٹھا کر دہلیز پار کی اَور گھروندے کے اَندر جا کھڑا ہُوا۔ جیَسے ہی اُنھوں نے ایک تیسرے آدمی کو کمرے میں کھڑا پایا، دونوں حملہ آوروں نے اپنے ہاتھ روک لئے۔ چہروں پہ ہلکی سی سراسیمگی لئے، جیَسے کوئی اِنتہائی غیر متوقع واقعہ پیش آگیا ہو، وہ کبھی اعجاز کو اَور کبھی زمین پہ پڑے اَدھ موئے جسم کو دیکھنے لگے۔ کچُھ دیر اسی طرح کھڑے رہنے کے بعد اُن میں سے ایک نے اوندھے پڑے آدمی کی پسلیوں پہ ایک زوردار لات جمائی اَور جان سے مار دینے کی دھمکیاں دیتے ہُوئے دونوں گھروندے سے نِکل گئے۔ سرفراز نے دیکھا کہ ایک کی سفید شلوار پہ زخمی کے خُون کے چھینٹے پھیلے تھے، جنہیں وہ جاتے جاتے تردد سے پائنچہ پھیلا کر دیکھ رہا تھا۔ یہ منظر سرفراز کو اَیسے لگا جیَسے وہ بہت دُور سے اِسے دیکھ رہا ہو۔

تین چار برس کی عُمر سے ہی سرفراز کے اَندر یہ ایک خاص اہلیت پیدا ہو گئی تھی، جس کا اُسے اب آکر کچُھ کچُھ احساس ہونا شرُوع ہُوا تھا۔ کِسی جگہ پر، کِسی شے کو، کِسی واقعہ کو دیکھتے ہُوئے معاً اُسے محُسوس ہوتا جیَسے وہ وہاں سے ہٹ کر دُور جا کھڑا ہُوا ہے اَور وہاں سے اس پہ نظر پھینک رَہا ہے، گویا وہاں حاضر بھی ہے اَور الگ بھی ہو گیا ہے، جیَسے دُوربین کے اُلٹے سرے سے نظارہ کر رہا ہو۔ اَیسے موقعوں پہ واقعات کی چھاپ اُس کے ذہن پہ روزمرہ کی نِسبت کہیں گہری ثبت ہو جاتی تھی۔ چند ماہ پہلے، جَب اعجاز اُس کے سکُول کا کام دیکھ رہا تھا، سرفراز نے اپنی سمجھ کے مطابق بھائی سے اِس کا ذِکر بھی کیا تھا۔

"لالہ! کوئی کوئی سبق مجُھے یاد ہو جاتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"کوئی کوئی نہیں ہوتا۔"

"یہی تو تیری مصُیبت ہے۔" اعجاز نے کہا۔ "آدھی بات تجُھے یاد رہتی ہے، آدھی تو بھُول جاتا ہے۔ اَیسے تو کام نہیں چلے گا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"پڑھتے پڑھتے کِتاب دُور چلی جاتی ہے۔"

"ہیں؟" اعجاز چونک اُٹھا۔ "دُور چلی جاتی ہے، دُور کیسے چلی جاتی ہے؟"

"پتا نہیں لالہ! کلاس میں ماسٹر صاحب بھی کبھی دُور چلے جاتے ہیں، بلیک بورڈ بھی۔"

اعجاز کئی لمحے تک تشویش سے اُسے دیکھتا رہا، پھر بولا۔ "جیسے کوئی خواب ہو؟"

"اونہوں!" سرفراز نے نفی میں سَر ہلایا۔

"اونہوں کیا۔"

"خواب میں تو سب کچھ اصلی لگتا ہے۔"

"تیری چیزیں جب دُور چلی جاتی ہیں تو اصلی نہیں لگتیں؟"

"اصلی لگتی ہیں۔"

"تو پھر؟"

"بس دُور سے دکھائی دیتی ہیں۔"

"اِسی لِئے تو بھول جاتے ہو۔"

"نہیں لالہ! جب دُور ہو جاتی ہیں تو نہیں بھولتیں۔"

"نہیں بھولتیں؟"

"اونہوں، صاف دکھائی دیتی ہیں۔"

"مجھے تو تیری سمجھ نہیں آتی سرفرازے!" اعجاز جھلا کر بولا۔ "تیرا دماغ بھٹکتا ہے، اِسی لِئے تیری یادداشت ٹھیک نہیں۔ دھیان دے کر پڑھا کر، فیل ہو گیا تو میری بے عزتی ہو جائے گی۔"

اب سرفراز دہلیز پہ کھڑا اُس گھروندے کے اندر، جہاں حملہ آوروں کے جاتے ہی مزدُور مرد، عَورتیں اَور بچّے عَود کر داخل ہو چکے تھے، دیکھ رہا تھا اَور نظروں ہی نظروں کے اندر گویا ہٹ کر الگ جا کھڑا ہُوا تھا، گو دروازے کے اندر رُکا تھا۔ اب زخمی اُسے نظر نہ آ رہا تھا۔ ایک ہجُوم کے جمگھٹے نے اُسے ڈھانپ لیا تھا، صِرف اُس کے کراہنے کی آواز سرفراز کو خوفزدہ کر رہی تھی۔

"ہائے، مجھے مار دیا، میری جان نکال دی۔ نہ کرو، مجھے ہاتھ نہ لگاؤ، اللہ کے واسطے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے قبر میں چھوڑ آؤ، مجھے کس گناہ کی سزا مل رہی ہے۔ مجھے قبر میں ڈال دو، ہائے۔۔۔"
گو سب مرد اور عورتیں اُس کے اُوپر جھکے ہُوئے ایک ساتھ بول رہے تھے اور اُسے سیدھے رُخ پہ لٹانے کی کوشش میں چیخ چیخ کر ایک دُوسرے کو ہدایات دے رہے تھے مگر اِس شور کے اندر سے اُٹھتی ہوئی زخمی آدمی کی کمزور سی آواز ایسی صفائی سے سرفراز تک پہنچ رہی تھی کہ جیسے اس گھروندے میں صرف وہی آواز موجُود ہو اور باقی سکُوت کا عالم ہو۔ سرفراز کی اس خاص کیفیت میں ایک اور بات بھی شامل تھی۔ وہ سامنے پیش آنے والے واقعہ سے نظر ہٹا کر گِردوپیش کا اُسی اِنہماک سے جائزہ لینا شُروع کر دیتا تھا، جیسے کلاس میں جب ماسٹر صاحب بولتے بولتے دُور چلے جاتے تو وہ بلیک بورڈ کے اِرد گِرد کی دیوار پر سفیدی، گردوغبار یا پنسل سے بنی ہُوئی مُختلف شکلوں کا جائزہ لینے لگتا، پڑھتے پڑھتے کتاب دُور چلی جاتی تو وہ حاشیے پر لگے ہُوئے دھبوں کا ملاحظہ کرنے لگتا تھا۔ اِسی طرح اب وہ لوگوں کے جمگھٹے سے نظر ہٹا کر گھروندے کے اندر نظر دوڑانے لگا۔ کچی دیواروں والا چھوٹا سا کمرہ تھا جِس میں نہ کوئی کھڑکی تھی نہ روشندان، صرف ایک رستہ آنے جانے کا دروازے کی صُورت میں تھا جِس کا ایک پٹ ندارد تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ زمین پر گدڑی بچھی تھی جِس پہ کچھ کپڑے پڑے تھے۔ آگے چند برتن اور مٹی کا چُولہا تھا جِس کے ساتھ لوہے کا توا کھڑا تھا اور پاس ہی بانس کی تیلیوں والی جھاڑُو رکھی تھی۔ کچھ دیر میں جب سرفراز کی آنکھیں اندھیرے سے مانُوس ہُوئیں تو اُسے گدڑی کے ساتھ تاریک کونے میں ایک اِنسانی شکل دکھائی دی۔ اُس نے نظریں جما کر دیکھا تو ایک سات آٹھ سال کا بچّہ تھا۔ ماسوا ایک لنگوٹی نما چیتھڑے کے جو اُس کی کمر کے ساتھ بندھا تھا، بچّہ بدن سے ننگا تھا۔ وہ کونے میں سکڑ کر بیٹھا تھا اور اُس کے چہرے سے ایک گہری، پیدائشی دہشت جھلک رہی تھی۔ بچّے کو اِس طرح بیٹھے دیکھ کر سرفراز کی نظروں کا فاصلہ سکڑنے لگا اور وہ واپس گھروندے میں پہنچ گیا۔ ساتھ ہی اُسے زخمی کی آواز پھر سُنائی دی۔

"ہا آ آ آ۔۔۔" وہ عجیب سی خُشک، روتی ہُوئی آواز میں پُکار رہا تھا۔ "مجھے ہاتھوں پر اُٹھا کر رکھو، رسُول کے واسطے زمین پر نہ ڈالو، میرا لُواں لُواں ٹُوٹ گیا ہے۔۔۔"

دفعتاً سرفراز کو احساس ہُوا کہ اُس خاصیت والی آواز اُس نے پہلے کہیں سُن رکھی ہے۔ وہ اپنے خیال میں اُسے تلاش کرنے لگا۔ پہلے اُس کا خیال اپنے باپ کی جانکنی پہ جا کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اٹکا۔ یہ پہلی بار تھی کہ بچّے نے اپنے باپ کی آخری آوازوں کو یاد کرنے کی کوشش کی تھی۔ جب وہ اُنہیں دھیان میں لایا تو اُسے معلوم ہوا کہ وہ آوازیں گیلی اور ملائم تھیں اور روتی ہوئی نہ تھیں بلکہ کھڑی کھڑی ہی ٹوٹتی جاتی تھیں۔ چند لحظوں کے بعد آخر اُس کی سوچ ایک جگہ پہ جاکر رُکی۔ اُسے پتا چل گیا کہ زخمی کی آواز کی کیفیت کیا تھی۔۔۔ اگر اس آواز سے الفاظ جُدا کرلئے جائیں تو یہ ہو بہو اس گائے کے ڈکرانے کی آواز سے مشابہہ تھی جسے بچپن میں اُس نے بچھڑا جنتے ہوئے سُنا تھا۔

اب اعجاز زخمی کے پاس کھڑا لوگوں کو پیچھے دھکیل رہا تھا۔

"ہوا لگنے دو، آگے سے ہٹ جاؤ، دروازہ چھوڑ دو بیوقوفو! دیکھتے نہیں ہوا بند ہو گئی ہے، اُسے سانس آنے دو، کیا ہلہ مار کے آگئے ہو، یہ کوئی تماشا ہے؟ چارپائی لے کر آؤ۔۔۔"

اپنے بھائی کا چہرہ دیکھ کر سرفراز کا جی شاداب ہو گیا۔ اُس نے محسُوس کیا کہ پژمُردگی کی وہ باریک سی جھلی جو اعجاز دِن بھر لِئے لِئے پھرتا رہا تھا، اب اُس کے چہرے سے غائب ہو چکی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں کے کناروں پہ اعتماد کی قوّت اُبھر آئی تھی۔ اعجاز کے اندر یہ تبدیلی سرفراز نے پہلے اُس وقت دیکھی تھی جب باہر سڑک پر عورت واویلا کر رہی تھی اور اعجاز اُس کے چہرے، اُس کے پھیلے ہوئے بازوؤں اور پھر کُرتے کے اندر اُس کی چھاتیوں کو ایسے مگن ہو کر دیکھے جارہا تھا جیسے کہ عورت کی آواز کو سُن ہی نہ رہا ہو۔ اب اعجاز کی آواز بھی بدل گئی تھی۔ اس میں ایک گونج پیدا ہو گئی تھی جیسے حلق کی بجائے چھاتی کے اندر سے نِکل کر آرہی ہو۔

"جی چارپائی تو کوئی نہیں ہے۔" کِسی نے کہا۔

"چارپائی کوئی نہیں ہے؟" اعجاز نے کمرے کے اندر نظر دوڑا کے دیکھا۔ "کِسی کی مانگ کر لے آؤ۔"

"چارپائی تو صرف جمعدار کے پاس ہے۔"

"تو اس سے لے آؤ۔"

اس پر کئی آوازیں ایک ساتھ اُٹھیں۔ "وہ شہر گیا ہُوا ہے۔"

ایک دُوسرا آدمی بولا۔ "شہر کہاں گیا ہے، سچی بات بولو۔"